امام شاطبیؒ کے اصول تفسیر: الموافقات کی روشنی میں اختصاصی مطالعہ

IMAM SHA'TBI'S PRINCIPLES OF QUR'ĀNIC INTERPRETATION: AN EXCLUSIVE STUDY IN THE LIGHT OF AL-MAWAFQAT

زبیر حسین شاہ*

ڈاکٹر محی الدین ہاشمی**

ABSTRACT

The present study is to discuss and highlight the work and the principles of Imām Shāṭibi which he introduced in the book Al-Mawafqat. Imām Shāṭibi (8th Century AH) was one of the scholars of Al-Andalus and a genius in Islamic jurisprudence and interpretation of Qur'an. He has authored several books and among them Al-i'tisam and Al-Mawafqat gained more popularity. Al-Mawafqat is mainly concerned with jurisprudence, ijtihad and the aims of Shari'ah. Within the discussion of jurisprudence, he has also stated the principles of interpretation of the Qur'an. In the present article, I have discussed eighteen of his principles which he has mentioned in his book Al Mawafqat. For the ease of readers, each principle is given a title in this article with an explanation and analysis to highlight his contribution in the fields of Islamic jurisprudence, Quranic interpretation, and Islamic Shari'ah.

KEYWORDS: Imam Shatibi, Tafseer, Quran, principle, scholar, Andalus

امام شاطبیؒ کا مختصر تعارف

آپؒ کا پورا نام ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الغرناطی ہے اور آپ "الشاطبی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت مشرقی اندلس کے شہر شاطبہ میں ۷۲۰ھ سے ۷۳۰ھ کے درمیان میں ہوئی۔ اپنے وقت کے بڑے شیوخ سے استفادہ کیا۔ آپ مالکیہ کے بڑے امام تھے۔ علم الحدیث، اصول فقہ، مقاصد شریعت، علم القراءات، علم التفسیر اور علم اللغۃ میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ آپ نے مختلف علوم وفنون میں کئی گراں قدر کتابیں لکھیں۔ آپ کی وفات ۷۹۰ھ بمطابق ۱۳۸۸ء کو غرناطہ میں ہوئی۔[1]

* پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ فکر اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد zubairshah60@gmail.com

** پروفیسر / چیئرمین شعبہ فکر اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد mohyuddin.hashmi@aiou.edu.pk

اصول تفسیر میں امام شاطبی کی خدمات اور اس موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ

امام شاطبی نے اپنی کتابوں بالخصوص "الموافقات" میں جابجا اصول تفسیر کے بارے میں اہم مباحث اور قواعد بیان فرمائے ہیں۔ ان میں بہت سے قواعد وہ بھی ہیں جو تعبیر کے فرق کے ساتھ امام شافعی اور امام ابن تیمیہ کے بھی اصول تفسیر ہیں۔ امام شاطبی کے اصول تفسیر کی اہمیت کے پیش نظر عرب جامعات میں اس پر پی ایچ ڈی اور ایم فل لیول کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً "اصول التفسیر و قواعدہ عند الامام الشاطبی فی کتاب الموافقات" کے نام سے بالخیر مراد نے جامعہ ابی بکر بلقاید الجزائر (University of Abou Bakr Belkaïd Algeria) سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔

عادل بو شاہد نے جامعۃ الامیر عبد القادر قسطنطینہ الجزائر (Emir Abdulkader University Constantine Alegria) سے ۲۰۱۳ میں "اصول التفسیر عند ابی اسحاق الشاطبی" کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ لکھا ہے۔

اصول و اصول تفسیر کا تعارف

امام شاطبی کے نزدیک اصول کی تعریف یہ ہے:

المراد بالاصول القواعد الکلیۃ، کانت فی اصول الدین آو فی اُصول الفقہ اَو غیر ذلک من معانی الشریعۃ الکلیۃ لا الجزئیۃ۔[2]

یعنی اصول سے مراد قواعد کلیہ ہیں خواہ وہ اصول دین ہوں یا اصول فقہ ہوں یا شریعت کے دیگر کلی معانی ہوں، تاہم یہ ضروری ہے کہ یہ اصول جزئی نہ ہوں۔

امام ابن تیمیہؒ نے بڑے جامع انداز میں اصول تفسیر کی تعریف کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اصول تفسیر وہ علم ہے جو ان قواعد کلیہ یا اصولوں سے بحث کرتا ہے جو مفسر کے لیے کتاب اللہ کو سمجھنے اور اس کی ایسی مرتب انداز میں تفسیر کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں، جو غلطی اور لغزش سے خالی ہے"[3]

امام شاطبیؒ کی شاہکار تصنیف "الموافقات" میں ایک جلد 'کتاب الادلۃ الشرعیۃ' کے نام سے موسوم ہے جس کی 'الطرف الثانی فی الادلۃ علی التفصیل' میں "الدلیل الاول الکتاب" کے عنوان کے تحت آپ نے قرآن مجید کو سمجھنے، اس کی تفسیر اور اس سے احکام کے استنباط کے اہم اصول بیان فرمائے ہیں۔

ذیل میں ہم ان اصولوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں "الموافقات" کے اصل متن کے ساتھ اس

کے اردو ترجمہ از مولانا عبد الرحمن کیلانی سے بھی مدد لی گئی ہے۔[4] لیکن صرف اردو ترجمہ پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ مشکل عبارت ہونے کی وجہ سے حتی الامکان بہت غور و فکر کے بعد درست ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ شریعت اسلامیہ میں فہم قرآن و سنت کی کلیدی حیثیت

چونکہ کتاب اللہ شریعت اسلامیہ کی کلی حکمت کا سرچشمہ، رسالت کی علامت اور دین حنیف کا ستون ہے، اس لیے جو شخص شریعت کی کلیات پر مطلع ہونے اور اس کے مقاصد جاننے کا خواہش مند ہو وہ نظری اور عملی طور پر قرآن مجید کو اپنا ہم نشین بنائے اور اس کام میں سنت سے مدد لے جو کتاب اللہ کی وضاحت کرنے والی ہے اور ضرورت کے وقت سلف متقدمین (صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین) کے کلام سے بھی مدد لے۔ قرآن مجید اگرچہ معجز کتاب ہے تاہم اس کی یہ حیثیت اسے ایسی عربی زبان ہونے سے خارج نہیں کرتی جو کلام عرب کے انداز پر جاری و ساری تھی۔ اللہ کے اوامر و نواہی کو سمجھنے کے معاملہ میں قرآن مجید ایک آسان کتاب ہے لیکن اس کے لیے عربی زبان کی مہارت شرط ہے۔[5]

۲۔ اسباب نزول کی معرفت اور فہم قرآن میں اس کی اہمیت

جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہو اس کے لیے "اسباب نزول" کی معرفت ضروری ہے اور اس پر دو امور دلالت کرتے ہیں۔

امر اول: معانی اور بیان ایسا علم ہے جس سے کلام عرب کے مقاصد کی پہچان کے ساتھ ساتھ نظم قرآنی کا اعجاز بھی معلوم ہوتا ہے، اس علم کا دارومدار محض کلام کے حالات کے مقتضیات پر ہوتا ہے کہ خود گفتگو، از روئے گفتگو کیسی ہے؟ یا گفتگو کرنے والا کون ہے؟ یا اس گفتگو کا روئے سخن کون ہے؟ یا مذکورہ سب باتوں پر اس کا مدار ہوتا ہے کیونکہ گفتگو ایک ہی ہوتی ہے جس کا مفہوم احوال، مخاطبین اور دوسرے امور کی وجہ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر استفہام کو لیتے ہیں کہ اس کا لفظ ایک ہوتا ہے لیکن اس میں تقریر، توبیخ (سرزنش) اور دوسرے کئی مفہوم داخل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح امر کے صیغے میں اباحت، تہدید، تعجیز وغیرہ داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے مرادی معنی پر خارجی امور کے سوا کوئی اور چیز دلالت کرنے والی نہیں ہوتی اور ان خارجی امور میں بنیادی چیز احوال کے مقتضیات ہیں یہ اس لیے بہت مشکل بات ہے کہ منقول کلام کے ساتھ ساتھ ہر حال اور ہر قرینہ کو بھی نقل کیا جائے اور اگر کلام کی مراد پر دلالت کرنے والے بعض قرائن نقل ہونے سے رہ جائیں تو پھر سارے کلام یا اس کے کچھ حصے کے فہم میں دشواری ہو سکتی ہے۔

اسباب نزول کی معرفت اس طرح کی ہر مشکل کو ختم کرنے والی چیز ہے اس لیے کتاب اللہ کے فہم میں یہ یقیناً نہایت اہم ہے۔ واضح رہے کہ سبب کی معرفت سے مراد مقتضائے حال کی معرفت ہے۔

امر ثانی: اسباب تنزیل سے لاعلمی کی وجہ سے شبہات اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور نصوص ظاہرہ کو مجمل بنانے کی نوبت آتی ہے جس سے باہمی اختلافات پیدا ہو کر نزاع میں پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔[6]

امام شاطبی نے اس بات کی وضاحت کے لیے صحابہ و تابعین کے کئی واقعات ذکر فرمائے ہیں جن کو طوالت سے بچنے کے لیے ذکر نہیں کیا جاتا۔

۳۔ قرآن مجید کے نزول کے زمانے کے عربوں کی عادات واطوار کی معرفت لازمی ہے

قرآن مجید کے نزول کے زمانے کے عربوں کے اقوال و افعال میں ان کی عادات و اطوار کی معرفت بھی لازمی ہے، چاہے اس کا کوئی خاص سبب نہ ہو، ورنہ ایسے شبہات اور اشکالات میں پڑ جانے کا خطرہ ہے جن سے نکلنا اس چیز کی معرفت کے بغیر مشکل ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وَأَتِمُّواْ ٱلۡحَجَّ وَٱلۡعُمۡرَةَ لِلَّهِ (اللہ تعالی کے لیے حج اور عمرہ کو پورا کرو)[7]

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اتمام یعنی پورا کرنے کا حکم دیا ہے، اصل حج کا حکم نہیں دیا کیونکہ حج تو عرب اسلام سے پہلے بھی کیا کرتے تھے لیکن بعض شعائر کو انہوں نے تبدیل کر ڈالا تھا اور بعض کو انہوں نے ختم کر دیا تھا جیسے وقوف عرفہ وغیرہ کو انہوں نے بدل ڈالا تھا، اس لیے ان کو پورا کرنے کا حکم دیا اور حج کی فرضیت کا حکم تو اس آیت کی رو سے پہلے ہی آ چکا تھا:

وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلۡبَيۡتِ مَنِ ٱسۡتَطَاعَ إِلَيۡهِ سَبِيلاً۔[8]

"اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے۔"[9]

اور جب یہ معلوم ہو گیا تو خود بخود یہ واضح ہو جائے گا کہ اس آیت میں حج یا عمرہ کے وجوب پر دلیل ہے یا نہیں۔[10]

۴۔ قرآن مجید میں بلا تبصرہ حکایت قابل استناد ہے

قرآن مجید میں جو بھی حکایت (یعنی کسی کا قول و فعل نقل کیا گیا) ہے، اس سے پہلے یا اس کے بعد اس کا جواب دیا گیا ہے۔ پس اگر اس منقول چیز کی تردید کی گئی ہو تو اس کے باطل اور جھوٹ ہونے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر اس کے ساتھ کوئی تردید نہ ہو تو یہ بات اس منقول چیز کے صحیح اور سچے ہونے کی دلیل ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو

اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور اس کی مثال باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ إِذْ قَالُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَىْءٍ۔[11]

''اور ان (کافر) لوگوں نے جب یہ کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا تو انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی۔''[12]

پھر اس کے فوراً بعد اللہ پاک نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ مَنْ أَنزَلَ ٱلْكِتَٰبَ ٱلَّذِى جَآءَ بِهِۦ مُوسَىٰ۔[13]

''(ان سے) کہو کہ: وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جو موسیٰ لے کر آئے تھے''[14]

دوسری صورت بھی بالکل واضح ہے لیکن اس کی صحت پر دلیل خود اس کو نقل کرنا اور اس کو برقرار رکھنا ہے کیونکہ قرآن مجید کو فرقان، ھدی، برھان، بیان اور تبیاناً لکل شيء سے موسوم فرمایا گیا ہے اور قرآن مجید اللہ کی مخلوق پر اللہ کی طرف سے اجمالی، تفصیلی، اطلاقی اور عمومی طور پر حجت ہے۔ ان سب اوصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید میں ایسی بات نقل ہوئی ہو جو درست نہ ہو پھر اس پر تنبیہ نہ کی گئی ہو۔[15]

۵۔ قرآن مجید میں ترغیب وترہیب ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں

قرآن مجید میں جب ترغیب آتی ہے تو اس کے آگے یا پیچھے یا قرآئن میں ترہیب بھی آتی ہے۔ یہی حال ترہیب کا ہے۔[16] یہی مضمون سیوطی نے الاتقان میں بھی ذکر کیا ہے۔

"اور ایسی باتوں سے جن میں کلام کا تضاد ہے جیسے عذاب کے بعد رحمت اور رہبت (خوف دلانے کے بعد) رغبت (ترغیب دینے کا ذکر) ہو۔ قرآن کا دستور ہے کہ جس موقع پر کچھ احکام کا ذکر کرتا ہے وہاں ان کے بعد ''وعد'' یا ''وعید'' کا تذکرہ بھی ضروری کر دیتا ہے۔ تاکہ یہ وعدہ یا دھمکی پہلے بیان کیے گئے احکام پر عمل کرنے کے لیے برانگیختہ کرے اور اس کے بعد توحید اور تنزیہ کی آیتیں ذکر فرماتا ہے تاکہ ان کے حکم دینے والا اور ان سے منع کرنے والے خدا تعالیٰ کی عظمت معلوم ہو۔"[17]

۶۔ قرآن مجید میں احکام شرعیہ کو کلیات کی شکل میں بیان کیا گیا ہے

قرآن مجید میں شریعت کے احکام زیادہ تر کلی طور پر بیان کیے گئے ہیں اور جہاں کہیں کسی جزئیہ کا بیان ہے تو اس کا ماخذ بھی کلی ہے خواہ یہ اعتبار (یعنی انجام کے اعتبار سے جسے استحسان کہا جاتا ہے) کے لحاظ سے ہو یا اصل کی علت (یعنی قیاس) کے لحاظ سے ہو، الّا یہ کہ جس حکم کی تخصیص کسی دلیل سے ہوئی ہو۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی تخصیصات

ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو (براہ راست) صرف قرآن ہی عطا ہوا ہے۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو وہ قرآن مجید کا بیان ہے۔ جب یہ بات ہے تو پھر قرآن اپنے اختصار کے باوجود جامع ہوگا اور جامع اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس میں کلی امور کو جمع کیا گیا ہو کیونکہ نزول قرآن کے مکمل ہونے پر شریعت پوری ہو گئی تھی جس کی دلیل باری تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ٱلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ۔[18] "آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔"

حالانکہ قرآن مجید میں نماز، زکوۃ، جہاد، نکاح، عقود، حدود اور قصاص وغیرہ کے احکام کی تفصیل نہیں دی گئی، بلکہ ان احکام کو تو سنت نے واضح کیا۔ اس لحاظ سے استنباط کے وقت محض قرآن پر بس نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی شرح اور بیان یعنی سنت کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔ اگر سنت کو مد نظر رکھنے کے باوجود بھی ضرورت رہے تو پھر السلف الصالح کی تفسیر دیکھنا چاہیے کیونکہ وہ قرآن کو دوسروں سے زیادہ جاننے والے تھے اگر پھر بھی حاجت رہے تو جسے مطلق طور پر عربی کا فہم حاصل ہو وہی کافی ہے۔ اس سے مراد وہ فہم ہے جو مشق و ممارست سے پیدا ہوتی ہے۔[19]

۷۔ فہم قرآن کے لیے درکار علوم اور قرآن کے ظاہر و باطن کی بحث

قرآن مجید سمجھنے اور اس سے علمی فوائد اخذ کرنے اور اللہ پاک کی مراد کی معرفت میں یہ علوم مددگار ہیں: لغت عربی کے علوم، علم القراءات، ناسخ و منسوخ کا علم، اسباب تنزیل کا علم، مکی اور مدنی سورتوں کا علم اور اصول فقہ کا علم۔[20]

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اور اس پر وہ کچھ احادیث و آثار سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ تو واضح رہے کہ ظاہر سے مراد عربی فہم ہے اور باطن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اپنے کلام اور خطاب سے مراد ہو۔ اب اگر کسی شخص نے مطلقاً یہ کہا کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور اس کی مراد وہی ہو جو ابھی واضح کی گئی تو تب تو وہ صحیح ہے۔ اور اس میں کوئی نزاع نہیں اور اگر قرآن کے ظاہر و باطن سے اس کی مراد کچھ اور ہو تو اس شخص کا یہ قول صحابہؓ اور ان کے بعد سلف سے ثابت شدہ امور پر ایک زائد امر کا اثبات ہو گا جس کے لیے یقینی دلیل کا ہونا ضروری ہے جو اس دعوی کو ثابت کر سکے کیونکہ وہ ایک اصل کا درجہ رکھتی ہے جس سے کتاب کی تفسیر پر حکم لگایا جا رہا ہے لہٰذا وہ ظنی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ مجھے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کے ساتھ (اپنی شوریٰ میں) شامل کر لیتے تھے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے ان سے کہا: "آپ نے تو صرف اسے شامل کر لیا ہے حالانکہ اس جیسے بیٹے تو ہمارے بھی ہیں؟ حضرت عمرؓ نے انہیں جواب دیا "یہ بات اس کے علم سیکھنے کی وجہ سے ہے" پھر مجھ سے اس آیت

کے بارے میں پوچھا إِذَا جَآءَ نَصرُ ٱللَّهِ وَٱلفَتحُ[21] (جب اللہ کی مدد اور فتح آگئی)۔ تو میں نے کہا اس میں رسول اللہ ﷺ کی دنیا سے رحلت فرمانے کی طرف اشارہ ہے جو اللہ پاک نے آپ ﷺ کو بتایا ہے پھر آخر تک یہ سورت پڑھی، حضرت عمرؓ کہنے لگے: "اللہ کی قسم! میں بھی اس آیت سے وہی کچھ سمجھا ہوں جو تم سمجھتے ہو۔"

چنانچہ اس سورت کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے پرودگار کی اس حمد کے ساتھ تسبیح بیان کیا کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور انہیں فتح دی اور اس کا باطن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی موت کی اطلاع دی تھی۔[22]

۸۔ قرآن فہمی کے لیے، معانی القرآن سے واقفیت کی اہمیت اور مثالوں سے اس کی وضاحت

عربی زبان کے ایسے معانی جن کے بغیر قرآن فہمی کی بنیاد قائم نہ ہو سکتی ہو، وہ سب قرآن کے ظاہر کے تحت داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم البیان کے مسائل اور علم البلاغت کے ذریعے اخذ کیے جانے والے عمدہ معانی سے انحراف نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ان فرامین میں "ضَيِّق"[23] اور "ضَائِق"[24] کے درمیان فرق کو سمجھ لے گا۔

يَجعَل صَدرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجا[25] (اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔) وَضَآئِقُۢ بِهِۦ صَدرُكَ[26] (اس (خیال) سے تمہارا دل تنگ ہو)

اور وہ فرق جو "یا ایھا الذین امنو" یا "یا ایھا الذین کفرو" کی ندا اور "یا ایھا الناس" یا "یا بنی اٰدم" کی ندا کے درمیان ہے۔[27]

اور وہ فرق جو عطف کا حرف چھوڑنے[28] سے پڑتا ہے جیسے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيهِم ءَأَنذَرتَهُم[29]

جو لوگ کافر ہوئے ان کے لیے برابر ہے کہ انہیں ڈرائے۔۔۔

اور عطف کے حرف کے ساتھ[30]۔۔۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشتَرِي لَهوَ ٱلحَدِيثِ[31]

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو بے ہودہ باتیں خرید تا ہے۔

اور ان دونوں سے پہلے مومنوں کا وصف گزر چکا ہے۔ اور حرف عطف کے ترک کی مثال یہ آیات بھی ہیں:

مَآ أَنتَ إِلَّا بَشَر مِّثلُنا[32]

تو ہمارے جیسا ہی ایک آدمی ہے۔[33]

وَمَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٞ مِّثۡلُنَا[34]

اور تو ہمارے جیسا ہی ایک آدمی ہے۔[35]

ان دو آیات میں عطف کو چھوڑنے اور عطف کو بر قرار رکھنے بارے میں مزید روشنی اس حاشیے میں دیکھیں۔[36] اور رفع اور نصب کے درمیان فرق ہے رفع جیسے قال سلام[37] اور نصب جو اس سے پہلے قول میں ہے قالوا سلما[38] (سلام اور سلاما کے فرق کے بارے میں مزید معلوم کرنے کے لیے یہ حاشیہ ملاحظہ کریں)[39]

اور نصیحت حاصل کرنے کے بارے میں فعل لانے سے[40] جیسے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَواْ إِذَا مَسَّهُمۡ طَٰٓئِفٞ مِّنَ ٱلشَّيۡطَٰنِ تَذَكَّرُواْ[41]

"جو لوگ پرہیز گار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں۔"[42]

اور ابصار مصدر سے اسم فاعل لانے سے[43] جیسے فَإِذَا هُم مُّبۡصِرُونَ[44] (تو دل کی آنکھوں سے دیکھنے والے ہیں)[45] کے درمیان فرق۔

نیز اذا اور ان کے درمیان فرق سمجھنے سے[46] جیسے:

فَإِذَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡحَسَنَةُ قَالُواْ لَنَا هَٰذِهِۦۖ وَإِن تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٞ يَطَّيَّرُواْ بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُۥٓ[47]

"جب انہیں کوئی آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسی اور ان کے رفیقوں کی بد شگونی بتلاتے۔"

اور جاء تھم اور تصبھم کے درمیان فرق۔ جب ماضی کا صیغہ[48] "اِذَا" کے ساتھ آئے اور مستقبل کا صیغہ[49] "اِنْ" کے ساتھ آئے جس طرح اللہ کا یہ قول ہے:

وَإِذَآ أَذَقۡنَا ٱلنَّاسَ رَحۡمَةٗ فَرِحُواْ بِهَاۖ وَإِن تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةُۢ بِمَا قَدَّمَتۡ أَيۡدِيهِمۡ إِذَا هُمۡ يَقۡنَطُونَ[50]

اور جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں ان کے اعمال کے سبب سے کوئی برائی پہنچے تو وہ ایک دم مایوس ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں فرحوا کو اذا کے بعد اور یقنطون کو "اِنْ" کے بعد لایا گیا ہے۔ ایسے ہی دوسرے امور ہیں جن کا متاخرین اہل بیان کے ہاں اعتبار کیا گیا ہے تو جب کسی شخص کو عربی زبان سیکھنے میں ان سب باتوں کا فہم حاصل ہو جائے تو اسے قرآن کے ظاہر کا فہم حاصل ہو جائے گا۔[51]

۹۔ باطن قرآن سے مراد اللہ تعالیٰ کا عرفان ہے

ہر وہ معنی جو مخاطب سے صفت عبودیت کے اثبات اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اقرار کا تقاضا کرتا ہو تو وہ قرآن کا باطنی معنی ہے جو اللہ پاک کی مراد اور مقصود ہے۔ جس کی خاطر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ مثال کے طور پر جب یہ آیت نازل ہوئی:

مَنۡ ذَا ٱلَّذِي يُقۡرِضُ ٱللَّهَ قَرۡضًا حَسَنٗا فَيُضَٰعِفَهُۥ لَهُۥٓ أَضۡعَافٗا كَثِيرَةٗ[52]

"کون ہے جو اللہ کو قرضہ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اسے کئی گنا زیادہ دے گا۔"

اس پر سیدنا ابو الدحداحؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کتنا کریم ہے کہ جو مال ہمیں خود اسی نے عطا فرمایا ہے، اس میں سے ہم سے قرض مانگتا ہے! جبکہ یہود نے اس آیت کے ظاہر کو دیکھ کر اعتراض کیا اور کہا: إِنَّ ٱللَّهَ فَقِيرٞ وَنَحۡنُ أَغۡنِيَآءُ[53] "بیشک اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں۔" پس سیدنا ابو الدحداحؓ اس آیت سے جو سمجھے تھے وہی درحقیقت اس آیت کی فقہ اور باطن تھا۔ اور یہود کا فہم محض ظاہر عربی سے زائد کچھ نہ تھا چنانچہ انہوں نے بے نیاز پروردگار کے قرض مانگنے کو ایک محتاج بندے کے قرض مانگنے پر محمول کیا۔[54]

۱۰۔ نزول قرآن کے وقت کی عربی قرآن کے مفہوم کے لیے معیار شمار ہو گی

چونکہ موافق و مخالف سب اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید اپنے زمانے کی خالص عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لیے ظاہر وہی معتبر ہے جو عربی زبان کا مفہوم ہو اور اس میں کسی قسم کا اشکال نہ ہو۔ پس قرآن مجید سے مستنبط کردہ ہر وہ معنی و مفہوم جو عربی میں جاری و ساری نہ ہو، اس کا علوم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہو گا، نہ تو وہ قرآن مجید سے اخذ کردہ شمار ہو گا اور نہ ہی اس سے کوئی استفادہ کیا جائے گا، اور جو کوئی ایسا دعوی کرے گا تو وہ مبنی بر باطل ہو گا۔ مثال کے طور پر رافضی فرقے "بیانیہ" کے بانی (بیان بن سمعان) نے دعوی کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "ھذا بیان للناس"[55] میں "بیان" سے مراد وہ خود ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی بھی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان کے لحاظ سے یہ شخص خالص احمق شمار ہو گا۔[56]

علامہ شاطبی نے یہاں اس اصول کی کئی مثالیں دی ہیں جنہیں ہم طوالت سے بچنے کے لیے ترک کرتے ہیں۔

۱۱۔ باطن قرآن کا ایک صحیح مصداق

باطن وہ ہے جو خطاب کی مراد ہو لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ عربی زبان کے مقررشدہ قواعد اور ظاہر کے مقتضا کے مطابق درست ہو اور عربی زبان کے مقاصد پر جاری ہو اور دوسری یہ کہ اس کے لیے

دوسرے مقام پر ایک شاہد موجود ہو چاہے وہ شاہد نص ہو یا ظاہر ہو، جو اس کی صحت کی شہادت دے اور اس شاہد کا کوئی معارض نہ ہو۔

جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے تو قرآن مجید کا عربی زبان میں نازل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اگر اس کا فہم کلام عربی کے مطابق نہ ہو تو اس کو علی الاطلاق عربی سے متصف نہیں کیا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسا مفہوم ہے جس کو قرآن پر چسپاں کیا جا رہا ہے حالانکہ یہ اپنے الفاظ اور معانی کے لحاظ سے قرآن پر بالکل دلالت نہیں کر رہا ہے اور جو مفہوم ایسا ہو گا تو اس کی نسبت قرآن کی طرف کرنا بالکل درست نہیں کیونکہ اس کی نسبت قرآن کی طرف نہیں بلکہ اس کے مدلول کی قرآن کی ضد کی طرف نسبت ہے مگر ان دو باتوں میں سے ایک پر دلالت کو ترجیح دینے والی کوئی چیز بھی موجود نہیں اس لیے ان دونوں میں سے ایک کو ثابت کرنا محض تحکم اور سینہ زوری اور قرآن پر افترا ہو گا اس صورت میں اس کا قائل اس گناہ میں داخل ہو گا جو اللہ کی کتاب میں علم کے بغیر کوئی بات کہنا ہے اور قرآن کے عربی ہونے سے متعلق مذکورہ دلائل یہاں بھی جاری ہوں گے۔

دوسری شرط کے مطابق اگر کسی دوسرے مقام پر اس کا شاہد موجود نہ ہو یا شاہد تو موجود ہو مگر اس کا کوئی معارض بھی تھا تو وہ ایسے ہی دعووں میں سے ہو گا جو قرآن پر کیے جاتے ہیں اور مجرد دعویٰ علماء کے اتفاق کے مطابق غیر مقبول ہوتا ہے۔

ان دو شرطوں کے موجود ہونے سے اس کے باطن ہونے کی صحت واضح ہو جائے گی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کیونکہ یہ دو شرطیں اس معاملہ میں بہت کافی ہیں۔[57] مثال کے طور پر اس آیت وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ[58] (اور سلیمان داود کا وارث ہوا)[59] کی باطنیہ نے جو یہ تفسیر گھڑ لی ہے کہ "امام نبی کے علم کا وارث ہوا" تو یہ باطن نہیں ہے کیونکہ وہ ظاہر میں سے نہیں۔ "ظاہر و باطن" کی بحث کے لیے یہ حاشیہ دیکھیں۔[60]

۱۲۔ علم تفسیر اور مشکلات القرآن

قرآن کریم میں اشکال والی تفاسیر بھی واقع ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس قبیل سے ہوں، یا صحیح باطن کے قبیل سے ہوں اور وہ اہل علم میں سے ہی کچھ لوگوں کی طرف منسوب ہیں اور کچھ سلف صالح کی طرف منسوب ہیں۔

ایسے مقامات میں سے ایک فواتح سور (حروف مقطعات) ہیں جیسے الم، المص، حم وغیرہ جن کی تفسیر کئی چیزوں سے کی گئی ہے۔ ان میں کچھ چیزوں کا تو صحیح معنی پر جاری ہونا معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسی نہیں۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ الم میں سے الف سے مراد اللہ، ل سے مراد جبریل اور م سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ یہ

بات اگر نقل میں درست بھی ہو تو بھی اشکال والی ہے کیونکہ کلام عرب میں تصرف کا یہ انداز ہر گز نہیں۔ ایسے حروف تو صرف اس وقت آتے ہیں جب ان پر کوئی لفظی یا حالی دلیل ہو۔ جیسے شاعر نے کہا۔

قالوا جمیعاً کلھم الافا (یعنی فار کبوا)

ولا ارید الشر الا ان تا (یعنی الا ان تشاء)[61]

اور الم میں قول ایسا نہیں۔ نیز خارج سے بھی کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کیونکہ اگر اس کی دلیل ہوتی تو عادت اس کی نقل کا تقاضا کرتی۔ اس لیے یہ ان مسائل میں سے ہے جس کی نقل کے لیے کافی محرکات ہیں، اگر یہ ان چیزوں سے ہو جن کا تفسیر کرنا درست ہے یا اس کے معنی کو سمجھانے کا قصد کیا جا سکتا ہے اور جب ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ فواتح متشابہات کی قبیل سے ہیں۔ اور ان سے اللہ کی مراد کو کوئی نہیں جان سکتا۔[62]

۱۳۔ صوفیا کے تفسیری اشارات اور اس کی تفسیری حیثیت

صوفیاء کے تفسیر اشاری سے متعلق امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

"فہم قرآن کے بارے میں سہل بن عبداللہ سے کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جنہیں قرآن کا باطن شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا[63] کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ انہوں نے کہا کہ "انداد" سے مراد "اضداد" ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا "نِد" (شریک) خود انسان کا نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنے مفادات اور ممنوع کاموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور یہ چیز اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نفس امارہ "انداد" کے عموم میں داخل ہے۔ حتی کہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو معنی یہ بنیں گے: اللہ تعالیٰ کے لیے شریک نہ بناؤ، نہ بت کو نہ شیطان کو، نہ نفس کو اور نہ فلاں چیز کو۔ اور ظاہر میں یہ بہت اشکال پیدا کرنے والی بات ہے کیونکہ آیت کا سیاق اور اس کے قرائن کا ماحصل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انداد سے مراد بت اور ان کے علاوہ ہر وہ چیز تھی جس کی وہ عبادت کرتے تھے اور وہ اپنے نفوس کی عبادت تو نہیں کرتے تھے نہ ہی انہیں رب بنایا تھا۔

پھر بھی سہل بن عبداللہ کی قول کی صحت کے لیے ایک توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ آیت کی تفسیر ہے بلکہ اس نے 'ند' کا معنی شرعی اعتبار میں پیش کیا جس پر قرآن مجید سے دو وجوہ سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔

ایک وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والا کبھی آیت کے وہ معنی لیتا ہے جو اعتبار کے باب سے ہو تو اسے ایسے مفہوم میں جاری کرتا ہے جس میں وہ آیت نازل نہ ہوئی تھی کیونکہ وہ قصد میں اس آیت کو اکٹھا کر لیتا ہے یا اس کے قریب کر دیتا ہے

کیونکہ ند کی حقیقت یہ ہے کہ اصل اپنی مخالفت پر اترنے والے شریک کے مخالف ہو جاتا ہے اور نفس امارہ کی بھی یہی پوزیشن ہے کہ وہ اپنے صاحب کو اپنے مفادات کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے اور اپنے خالق کے حقوق کی نگہداشت کو روکنے والا یا اس سے غافل کرنے والا ہے۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے سہل نے شریک کے مقابلے پر شریک مراد لیا ہے کیونکہ بتوں کو تو وہ بعینہ اسی معنی کے مطابق قائم کرتے ہیں اور اس اعتبار کی صحت کا شاہد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

ٱتَّخَذُوٓاْ أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَٰنَهُمۡ أَرۡبَابٗا مِّن دُونِ ٱللَّهِ[64]

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنالیا تھا۔

حالانکہ وہ عبادت اللہ ہی کی کرتے تھے اور ان کی نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ ان کے احکام بجالاتے اور جس چیز سے بھی وہ روکتے رک جاتے۔ جن چیزوں کو وہ حرام کہتے انہیں حرام سمجھتے اور جو چیزیں وہ ان کے لیے جائز قرار دیتے تھے انہیں حلال سمجھتے تھے۔ اور یہی اس شخص کی حالت ہے جو اپنی نفس کی خواہش کی پیروی کرتا ہو۔

دوسری جہت کے مطابق یہ آیت اگرچہ بت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی ہے تاہم اس میں اہل اسلام کے لیے بھی اتنی ہی عبرت ہے۔ آپ حضرت عمرؓ کے اس قول کو نہیں دیکھتے جو انہوں نے اہل ایمان میں سے اس شخص کو کہا جس نے دنیا میں کشادگی اختیار کرلی تھی۔ آپ نے اس سے کہا: تمہیں یہ آیت کہاں لے جائے گی تم اپنا پاکیزہ رزق اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے۔[65] اور آپؓ اپنے آپ کو بھی اس آیت پر قیاس کرتے۔ وَيَوۡمَ يُعۡرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبَاتِكُمۡ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا۔[66] اور جس دن کافروں کو آگ پر پیش کیا جائے گا (ان سے کہا جائے گا) تم (اپنا حصہ) پاک چیزوں میں سے اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور تم ان سے فائدہ اٹھا چکے۔ حالانکہ یہ آیت دراصل کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اور یہ معنی عموم و خصوص میں ثابت ہیں۔ تو جب یہ صورت ہو تو فلا تجعلو للہ اندادا کا اسی قدر نفس امارہ پر اطلاق کرنا درست ہو گا۔ واللہ اعلم۔[67]

۱۴۔ سہل بن عبداللہ کے بعض تفسیری اشارات پر تبصرہ

سہل بن عبداللہؒ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان إِنَّ أَوَّلَ بَيۡتٖ وُضِعَ لِلنَّاسِ[68] "بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر ہوا" میں کہا کہ "بیت" کا باطنی معنی محمد ﷺ کا دل ہے جس پر وہی شخص ایمان لاتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنی توحید کو جمادے اور وہ شخص آپ ﷺ کی ہدایت کی اقتداء کرے۔

یہ تفسیر بیان کی محتاج ہے کیونکہ یہ معانی ایسے ہیں جنہیں عرب نہ جانتے تھے، نہ اس میں کوئی ایسی جہت ہے کہ اس کا

مجازی استعمال مناسب ہو، نہ ہی یہ کسی حال میں سیاق وسباق سے کوئی مطابقت رکھتی ہے۔ تو پھر یہ تفسیر کیسے ہوئی؟ اور اس اعتراض سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو قرآن کی تفسیر ہونے پر دلالت کرے۔ تو اس صورت میں اشکال زائل ہو جائے گا۔

اور ایک اللہ تعالیٰ کے اس قول: يُؤْمِنُونَ بِٱلْجِبْتِ وَٱلطَّـٰغُوتِ[69] ”جو بت اور باطل معبود پر ایمان رکھتے ہیں“ کی تفسیر کرتے ہوئے اس نے کہا: سب طاغوتوں سے بڑا طاغوت تو نفس ہے جو برائی کا حکم دیتا ہے کہ جب بھی اس سے خلوت ہو تو معصیت کے لیے کہتا ہے۔ یہ تفسیر بھی اپنے ماقبل کی قسم سے ہی ہے۔

اور اللہ کے قول وَٱلْجَارِ ذِي ٱلْقُرْبَىٰ[70] (اور قرابت دار ہمسایہ سے) کے متعلق کہا کہ اس کا باطن دل ہے اور وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ[71] (اور اجنبی ہمسایہ سے) کا باطن نفس طبیعی ہے اور وَٱلصَّاحِبِ بِٱلْجَنۢبِ[72] (اور پہلو کے ساتھی سے) کا باطن وہ عقل ہے جو شریعت کی اقتداء کرے۔ اور وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ[73] (راہ کے مسافر سے) کا باطن وہ اعضاء ہیں جو اللہ کی مطیع ہوں اور یہ سب اس کے کلام میں اشکال والے مقام ہیں۔ اور اس جیسی دوسری تاویلیں بھی کیونکہ جو کچھ اس خطاب سے کلام عرب کا مفہوم ہے وہ تو ظاہر ہے کہ الجار ذی القربیٰ اور اس کے ساتھ والے الفاظ سے مراد وہی ہے جو ابتداءً سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی مراد کو اہل عرب نہیں جانتے تھے خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر ہوں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سلف صالح یعنی صحابہ اور تابعین سے قرآن کی اس جیسی یا اس سے ملتی جلتی تفسیر منقول نہیں ہے۔ اگر ان کے ہاں ایسی مراد معروف ہوتی تو ضرور منقول ہوتی۔ کیونکہ باتفاق ائمہ وہ لوگ قرآن کے ظاہری اور باطنی مفہوم سے زیادہ واقف تھے۔ اور اس امت کے بعد میں آنے والے لوگ پہلوں سے نہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں اور نہ ہی شریعت کو ان سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ علاوہ ازیں کوئی ایسی دلیل بھی نہیں جو اس تفسیر کی صحت پر دلالت کرے۔ نہ ہی آیت کا سیاق ایسا ہے۔ وہ تو اس کی نفی کرتا ہے۔ اور خارج سے بھی اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ ایسی تفسیر اس تفسیر کے قریب تر ہے جو باطنیوں یا ان جیسے لوگوں کے کلام میں ہے جس کی قرآن سے نفی اور تردید ثابت ہو چکی ہے۔[74]

۱۵۔ تفسیر قرآن میں الاعتبار والتاویل سے مدد لینا

دلوں پر وارد ہونے والے اور آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے والے قرآنی اعتبارات جب اپنی تمام شرطوں کے ساتھ درست ہوں تو ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا اصل منبع قرآن ہے اور باقی موجود چیزیں اس کی پیروی کرتی ہیں کیونکہ مکمل طور پر صحیح اعتبار وہ ہے جس میں بصیرت کا نور بلا توقف کائنات کے پردوں کو چاک کر دے اور

اگر توقف ہو تو وہ غیر صحیح اور نامکمل ہے جیسا کہ سلوک کے اہل تحقیق نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

اور دوسری قسم وہ ہے جس کا اصل منبع تو موجود چیزوں سے ہو خواہ اس کی جزئی سے ہو یا کلی سے اور قرآن کا اعتبار اس کی پیروی کرے۔

اگر پہلی قسم ہے تو یہ اعتبار صحیح ہے اور بغیر کسی اشکال کے قرآن کا باطن سمجھنے میں قابل اعتبار ہے کیونکہ قرآن کا فہم دلوں پر اسی طرح وارد ہوتا ہے جس طرح کہ اس دل کے لیے قرآن اترا ہے۔ قرآن مکمل ہدایت ہے اور مکلفین میں سے ہر ایک کو اس کی لیاقت اور تکالیف اور احوال کے حساب سے اس کا فہم عطا ہوتا ہے، علی الاطلاق نہیں اور جب یہ صورت حال ہے تو اس کی راہ پر چلنا صراط مستقیم پر چلنا ہو گا اور اس لیے بھی کہ قرآنی اعتبار کسی کو کم ہی ملتا ہے الا یہ کہ وہ اس پر عمل پیرا ہو خواہ تقلیداً ہو یا اجتہاداً ہو۔ ایسے لوگ قرآن مجید میں اعتبار کے وقت اس کی حدود سے باہر نہیں جاتے جیسا کہ اس پر عمل کرنے اور اس کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کرنے میں بھی اس کی حدود سے باہر نہیں جاتے بلکہ ان کے لیے اس کے احکام کے برابر اس میں فہم کے دروازے بھی کھلنے لگتے ہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ اس کی گزرگاہوں پر چلنے کو ہی قابل اعتبار سمجھا جائے۔ اور اس بارے میں سلف صالح کے فہم کے متعلق جو کچھ منقول ہے وہ اس پر شاہد ہے کیونکہ یہ سب کچھ اس چیز پر جاری ہو گا جس کا عربی زبان تقاضا کرتی ہے اور شرعی دلائل دلالت کرتے ہیں جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اور اگر دوسری قسم ہو تو قرآن کے باطن کے فہم کے اعتبار میں توقف لازم ہے اور اسے علی الاطلاق قبول کر لینا ناجائز ہے کیونکہ وہ پہلی قسم کے برعکس ہے۔ لہذا فہم قرآن میں اس کے اعتبار سے علی الاطلاق کچھ کہنا درست نہ ہو گا۔[75]

۱۶۔ سورتوں کی ترتیب نزولی اور فہم قرآن میں اس کی اہمیت

قرآن مجید کی تفسیر کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ترتیب نزولی کا خیال رکھا جائے اور مدنی سورتوں کو مکی سورتوں کے ساتھ ملا کر غور کرنا چاہیے اور اسی طرح مکی سورتوں میں بعض کو بعض اور مدنی سورتوں کو بھی بعض کو بعض پر کہ جس ترتیب سے وہ نازل ہوئیں مبنی کرنا چاہیے، ورنہ بات صحیح نہیں ہو گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ مدنی سورتوں کے خطاب کا معنی اکثر مکی سورتوں پر مبنی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر بعد میں نازل ہونے والی سورت اپنی پہلی پر مبنی ہے اور اس پر استقراء دلالت کرتا ہے۔ جو یہ ہے کہ بعد والی سورتوں میں صرف مجمل کا بیان ہو گا یا عموم کی تخصیص یا مطلق کی تقیید ہو گی یا ایسی چیز کی تفصیل جو مفصل نہ تھی یا ایسی تکمیل جس کی تکمیل واضح نہ تھی۔

اور اس اصل پر سب سے پہلا شاہد شریعت ہے جو مکارم اخلاق کو پورا کرنے کے لیے آئی اور ملت ابراہیمؑ میں جو پہلے بگاڑ پڑ چکا تھا اس کی مصلح بن کر آئی ہے اور اس سے قریب تر سورہ انعام کا نزول ہے کیونکہ وہ اصول دین اور عقائد کے قواعد کی وضاحت کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے علماء نے اس سورت سے توحید کے ایسے قواعد کی تخریج کی ہے جس کی متکلمین نے اثبات واجب الوجود سے لے کر اثبات امامت تک کی ہے۔ یہ تو متکلمین کی بات تھی اور جب ہم اس کتاب کے انداز بیان میں غور کرتے ہیں تو جلد ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ شریعت کے کلی قواعد کی وضاحت ہے کہ اگر ان سے کسی ایک کلی میں گڑبڑ ہو جائے تو نظام شریعت ہی درہم برہم ہو جاتا ہے یا اس سے اس کلی کی اصل ناقص ہو جاتی ہے۔

پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ پر سب سے پہلے سورہ بقرہ نازل ہوئی جس نے تقوی کے ان قواعد کو مؤکد کیا جو سورۃ انعام میں ذکر ہونے والے قواعد پر مبنی تھے۔ اس سورت نے تمام مکلفین کے افعال کی اقسام کی وضاحت کی۔ اگرچہ ان کی تفاصیل دوسری سورتوں میں واضح ہوئیں نیز اس سورت میں حفظ دین بھی ہے پھر مدنی سورتوں میں سے سورہ انعام کے بعد نازل ہونے والی سورتیں انعام پر مبنی ہیں اور جب آپ ان تمام سورتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی ترتیب پر اتاریں گے تو آپ یہی دیکھیں گے کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے مقابلہ پر آرہا ہے اور اس معنی میں کتاب کی کوئی چیز ناظر سے پوشیدہ نہ رہے گی گویا یہ تفسیر کے علوم کے اسرار ہیں جس حد تک کسی کو ان کی معرفت ہو گی اتنی ہی اسے اپنے پروردگار سبحانہ کے کلام کی معرفت حاصل ہو گی۔[76]

۱۷۔ فہم قرآن اور سنت نبویہ

اس معاملہ میں سنت کو بھی دخل ہے کیونکہ وہ کتاب اللہ کی وضاحت کرتی ہے اور اسی کے موافق تفسیر کرتی ہے کہ اس کی تقدیم و تاخیر سے حدیث میں ناسخ و منسوخ کی وضاحت معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور مشروعات میں بہت چیزیں ایسی ہیں جن کا پہلے حدیث میں بیان آیا بعد میں ان کی تاکید ہوئی۔ اس میں ایسے اطلاق و عموم آتے ہیں جو بسا اوقات وہم میں ڈال دیتے ہیں تو ان سے وہی کچھ سمجھا گیا کہ اگر ان مشروعات کے اثبات کے بعد آیات وارد ہوتیں تو ان سے بھی وہی کچھ سمجھا جاتا۔ جیسے یہ حدیث: من مات وہو یعلم ان لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ[77]

جو شخص مر جائے اور وہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہو گا۔

یا یہ حدیث: ما من احد یشہد ان لا الہ الا اللہ وان محمد ارسول اللہ صادقا من قلبہ حرمہ اللہ علی النار[78]

جو شخص بھی اپنے سچے دل سے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اللہ دوزخ کی آگ اس پر حرام کر دے گا۔

اور اس معنی میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کی وجہ سے امت میں اس بارے میں اختلاف واقع ہوا کہ جو یہ دونوں شہادتیں تو دیتا ہو مگر اللہ کی نافرمانی کرتا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ ''مرجئہ'' علی الاطلاق ان ظواہر کے مقتضی پر چلے اور جو چیز بھی اس سے معارض تھی وہ ان کے ہاں قابل تاویل تھی اور اہل سنت والجماعت ان کی مخالف راہ پر چلے جس حد تک کہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے انہوں نے ظواہر کی تاویل کی۔

منجملہ سلف ہی کے ایک گروہ نے کہا کہ: یہ احادیث مسلمانوں کی ابتدائی حالت پر نازل ہوئیں جبکہ ابھی فرائض اور اوامر و نواہی نازل نہ ہوئے تھے اور یہ تو معلوم ہے کہ جو شخص اس دور میں مرا ہو جس نے نہ نمازیں پڑھی ہوں نہ روزے رکھے ہوں اور جو کام شریعت میں حرام کیے گئے وہ کرتا رہا ہو تو اس پر کوئی تنگی نہیں کیونکہ بعد کی چیز کا وہ مکلف ہی نہ تھا لہذا اس کے اسلام کے معاملے سے کچھ بھی ضائع نہ ہوا جیسے کوئی شخص اس حال میں مرا کہ شراب اس کے پیٹ میں تھی جبکہ ابھی شراب حرام ہی نہ ہوئی تھی تو اس پر کوئی تنگی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ۔ (79)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان پر کچھ گناہ نہیں۔

اسی طرح جو شخص کعبہ کی طرف تحویل قبلہ سے پہلے مر گیا تو جو نمازیں اس نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہیں ان میں اس پر کچھ تنگی نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ (80)

اور اللہ ایسا نہیں کرتے کہ تمہارے ایمان ضائع کر دے۔

اور اسی قبیل کے دوسرے ارشادات جو اس مدعا کو صراحت سے ثابت کرتا ہے کہ کتاب و سنت کے فہم میں نزولی ترتیب کا اعتبار مفید ہوتا ہے۔ (81)

۱۸۔ تفسیر بالرائے اور اس سلسلے میں ممدوح و مذموم کی تقسیم

کچھ روایات میں قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی رائے کے استعمال کی مذمت آئی ہے جبکہ بعض روایات سے اس میں اپنی رائے استعمال کرنے کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: جبکہ آپ کو قرآن میں سے کسی چیز کے متعلق پوچھا گیا تھا:

"وہ کون سا آسمان ہے جو مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین ہے جو مجھے اٹھائے گی اگر میں اللہ کی کتاب میں وہ بات کہوں جو میں جانتا نہیں؟"

اور اکثر روایتوں میں یوں آیا ہے:

"جب میں اللہ کی کتاب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں۔"

پھر آپ سے "کلالہ" کے بارے میں پوچھا گیا جو قرآن میں مذکور ہے تو آپ نے فرمایا: "میں اپنی رائے سے کہہ رہا ہوں اگر یہ درست ہو تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہو تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔ کلالہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔"

گویا یہ وہ اقوال ہوئے جو قرآن میں رائے کے استعمال کا اور رائے کے ترک کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

اس بارے میں فیصلہ کن قول یہ ہے کہ رائے کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ جو کلام عرب اور کتاب و سنت کی موافق ہو اور جو شخص ان دونوں باتوں کا عالم ہو اسے رائے سے غفلت نہ برتنا چاہیے۔ جس کی وجہ درج ذیل امور ہیں:

امر اول: کتاب میں قول کے بغیر چارہ نہیں۔ خواہ معنی کا بیان ہو یا حکم کا استنباط، یا لفظ کی تفسیر اور یا مراد کا فہم ہو۔ اور یہ سب پہلے لوگوں سے منقول نہیں۔ پھر اگر ان سے توقف کرے تو سب احکام یا اکثر احکام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے۔ لہذا قرآن کے متعلق حالات کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔

امر دوم: اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہر ایک بات پوری طرح سمجھا دیتے۔ اور کسی کو قرآن میں غور کرنے یا بات کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو اس پہلو سے مکلف نہیں بنایا گیا تھا۔ بلکہ آپ نے صرف وہ امور بیان فرمائے جن کو جانے بغیر مقصد تک نہ پہنچا جا سکتا تھا اور بہت سا حصہ چھوڑ دیا جس کو اہل اجتہاد اپنے اجتہاد سے معلوم کر سکتے تھے۔ لہذا قرآن کی پوری تفسیر سے آپ کا واقف کرانا آپ پر لازم نہ تھا۔

امر سوم: صحابہ کرامؓ اس بارے میں دوسروں سے زیادہ محتاط تھے اور یہ تو معلوم ہے کہ انہوں نے بھی جو سمجھا اس کے مطابق تفسیر کی اور انہیں کی جہت سے ہمیں قرآن کے معنی کی تفسیر پہنچی ہے اور توقیف (منزل من اللہ ہونا) اس بات کے منافی نہیں۔ لہذا ہر قول کو توقیفی سمجھنا اور رائے کی ممانعت درست نہیں۔

امر چہارم: ایسا مفروضہ ہی ناممکن ہے کیونکہ قرآن میں نظر دو جہتوں سے ہوتی ہے۔ ایک امور شرعیہ کی جہت ہے اس میں توقیفی ہونے کا قول ہے اس میں رائے اور فکر کے ترک کو تسلیم کیا جاسکتا ہے اور دوسری عربی زبان کے مآخذ کی جہت ہے۔ اس میں توقیف ممکن نہیں۔ ورنہ سلف اولین کی تفسیروں میں بھی توقیف لازم آئے گی اور یہ باطل ہے۔

دوسری قسم کی رائے: ایسی رائے جو عربی لغت کے موافق نہ ہو یا شرعی دلائل پر جاری نہ ہو تو ایسی رائے بغیر کسی اشکال کے مذموم ہے۔ جیسا کہ یہ قیاس میں بھی مذموم ہے۔ کیونکہ یہ بغیر دلیل کے اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ قسم ہے جس میں قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے کے بارے میں سخت وعید آئی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تاویل میں قول (بالرائے) سے بچنا چاہیے الا یہ کہ کوئی دلیل موجود ہو۔ کیونکہ قول (بالرائے) کے لیے بطور آلہ جس علم کی ضرورت ہے اس علم میں لوگوں کے تین طبقے ہیں:

پہلا طبقہ: جو راسخین کے رتبہ تک پہنچا ہو۔ جیسے صحابہؓ، تابعین اور ان کے قریب لوگ۔ اور یہ لوگ نہایت حزم و احتیاط، ہیبت اور خوف سے قرآن میں بات کہتے تھے۔ لہٰذا ہمیں ان کے بارے میں کوئی بات کرنے سے بدرجہ اَولیٰ محتاط رہنا چاہیے۔ اور (خدانخواستہ) اگر ہم اپنے آپ کو علم اور فہم میں ان جیسا سمجھتے ہوں تو یہ بات بہت قابل افسوس ہے۔

دوسرا طبقہ: وہ ہے جو اپنے متعلق یہ جانتا ہو کہ وہ ان کے درجہ کو یا اس سے قریب تر درجہ کو نہیں پہنچا۔ ایسے لوگوں پر قول (بالرائے) کے حرام ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔

تیسرا طبقہ: وہ ہے جس میں اہل اجتہاد کے درجہ تک پہنچنے میں شک ہو یا اس کے کچھ علوم کے متعلق ایسا گمان ہو۔ ان لوگوں کے لیے بھی قول (بالرائے) کی ممانعت ہے۔[82]

خلاصہ بحث

امام شاطبی رحمہ اللہ نے اصول تفسیر کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ فرمایا ہے مگر یہ اضافہ کسی تفسیر یا علوم القرآن کی صورت میں انہوں نے نہیں کیا ہے بلکہ اصول فقہ اور مقاصد شریعت پر لکھی گئی ان کی شاہکار تصنیف "الموافقات" میں موجود ہے ہمارے ہاں کے اہل علم کی توجہ اس طرف زیادہ مبذول نہ ہو سکی۔ امام شاطبی کی الموافقات میں جو اصول مذکور ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو فہم قرآن میں انتہائی موثر ہیں گو کہ بعض ایسے اصول بھی شامل ہیں جو

دیگر اہل علم نے پہلے بتائے ہوئے ہیں ان اصول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی زبان پر اصول فقہ کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

سفارشات

۱۔ علامہ شاطبی کے اصول تفسیر پر ایم فل، پی ایچ ڈی کی سطح کے مزید کام کرنا چاہیے۔

۲۔ علامہ شاطبی کی دیگر کتب سے بھی رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تمام تصانیف میں بکھرے ہوئے اصول تفسیر کو زیر بحث لانا چاہیے شاید ان کی دیگر تصانیف میں مزید اصول بھی مل جائیں۔

۳۔ ان کے اصولوں کو دیگر اہل علم کے اصولوں کے ساتھ تقابلی طور پر مطالعہ کرنا چاہیے۔

۴۔ اصول تفسیر اور اصول فقہ کا باہمی تعلق اور تقابل معلوم کرنا چاہیے۔

۵۔ امام شاطبی کے اصول تفسیر کا بائبل کے اصول تشریح کے ساتھ موازنہ و تقابل کرنا چاہیے۔

۶۔ امام شاطبیؒ کے اصولوں کو ہرمنیوٹکس کے ساتھ موازنہ و تقابل کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

1۔ عمر رضا، معجم المؤلفین، کحالۃ، بیروت: الناشر مکتبۃ المثنی بیروت داراحیاء التراث العربی، ص۱۱۸ج۱

2۔ ابو اسحاق ابرہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الغرناطی الشاطبی (م ۷۹۰ھ)، الموافقات فی اصول الاحکام، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ: دار ابن عفان للنشر والتوزیع، طبع اول ۱۹۹۷، ص ۳۲۳ج ۳

3۔ تقی الدین ابو العباس ابن تیمیہ، مقدمہ اصول تفسیر، دار المکتبۃ الحیاۃ، بیروت، لبنان، ص ۷ ج ۱، ۱۳۹۰ء

4۔ مولانا عبد الرحمن کیلانی، مترجم الموافقات فی اصول الشریعۃ، لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ، طبع اول

5۔ الشاطبی، الموافقات، ص ۱۴۴ج ۴

6۔ الموافقات، ص ۱۴۶ج ۴

7۔ القرآن، سورۃ البقرۃ ۲:۱۹۶

8۔ القرآن، سورۃ آل عمران ۳:۹۷

9۔ مفتی تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، کراچی: مکتبہ معارف القرآن

10۔ الموافقات ص ۱۵۴ج ۴

11۔ القرآن، سورۃ الانعام ۶:۹۱

12۔ ترجمہ از آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی

13۔ القرآن، سورۃ الانعام ۶:۹۱

14۔ ترجمہ از آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی

15۔ الموافقات، ص۱۵۸ تا ۱۶۰، ج۴

16۔ الموافقات، ص۱۶۷، ج۴

[17]۔ السیوطی، جلالدین عبدالرحمن بن ابی بکر (م ۹۱۱ھ)، الاتقان فی علوم القرآن، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ: وزارۃ الشؤون الاسلامیۃ والاوقاف والدعوۃ الارشاد، ۶۲ ویں نوع (فی مناسبۃ الایات والسور)، فصل، المناسبہ، ص ۳۲۴، ج۳

18۔ القرآن، سورۃ المائدۃ ۵:۳

19۔ الموافقات، ص۱۸۰ تا ۱۸۳ ج۴

20۔ الموافقات، ص۱۹۸ ج۴

21۔ القرآن، سورۃ النصر ۱۱۰:۱

22۔ الموافقات، ص۲۰۸ تا ۲۱۰ ج۴

[23]۔ صفت مشبہ ہے جو ثبوت اور دوام پر دلالت کرتی ہے اور اسی وجہ سے اس کو اس شخص کے لیے ثابت کیا جسے اللہ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے یعنی اس کی سینہ کی تنگی مستقل اور ہمیشہ ہوگی۔

[24]۔ اسم فاعل ہے جو عارضی طور پر واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بات رسول اللہ ﷺ کی شان کے موافق ہے کہ آپ ﷺ کا دل تھوڑی دیر کے لیے تنگ ہوا۔

25۔ القرآن، سورۃ الأنعام ۶:۱۲۵

26۔ القرآن، سورۃ ھود ۱۱:۱۲

[27]۔ امر خاص للمومنین ہو تو یا ایہا الذین امنو ہوگا۔ اور خاص للکفار ہو تو یٰۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ہوگا۔ اور اگر امر عام ہو تو یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اور یا بنی آدم ہوگا۔ قرطبی نے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (البقرۃ:۲۱) کی تفسیر میں کہا ہے کہ یٰۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صرف مدنی سورتوں میں ہے۔ اور عروہ بن زبیرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جس میں حد یا فریضہ کا ذکر ہوگا تو وہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ اور جس میں اُمم یا عذاب کا ذکر ہوگا تو وہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔

[28]۔ ان الذین سے پہلے واو نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے الکتاب (قرآن مجید) میں شک نہ ہونے کا بیان تھا۔ پھر ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اس کتاب سے ایمان لاکر فائدہ اٹھایا اور ہدایت پاگئے۔ اب یہاں یہ مضمون ختم ہوگیا۔ (صفت مضادہ ہے اور ویضدھا تتبین الاشیاء۔ السیوطی، الاتقان، ۶۲ ویں نوع (فی مناسبۃ الایات والسور)، فصل، المناسبہ، بحث، المضادہ، ج۳، ص ۳۲۵۔ اب ان لوگوں کا بیان شروع ہوا جن میں کتاب سے فائدہ اٹھانے کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ لہذا بغیر حرف عطف ان الذین کفروا کے بعد شروع کی گئی۔ گویا کفار کا الکتاب سے کوئی تعلق نہیں اور وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ یہ "الوصل والفصل"، علم المعانی کی بحث ہے اس جگہ فصل ہے گویا انقطاع کامل ہے۔

29۔ القرآن، سورۃ البقرۃ ۲:۶

[30]۔ سورہ لقمان کے شروع میں بھی یہی مضمون ہے کہ کتاب حکیم کی آیات سے فائدہ اٹھا کر اقامت الصلوۃ، ایتاءز کوۃ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہدایت و فلاح پاتے ہیں۔ و من الناس اس شخص کا بیان ہے جس کا عمل پہلی آیتوں کے متضاد ہے۔ مگر یہاں باوجود اس کے واو حرف عطف لا کر اس کو ما قبل سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ انقطاع کامل نہیں ہے۔ کیونکہ غنا یعنی موسیقی کے آلات خریدنا یا موسیقی اختیار کرنا فسق ہے جو مکہ والوں کے کفر سے بہت کم درجے کا گناہ ہے۔ اس وجہ سے الکتاب سے فائدہ کم تو ہو جاتا ہے لیکن ختم نہیں ہوتا۔ گویا من جملہ اتصال ہے اور من جملہ انقطاع ہے تو قاعدے کے مطابق یہاں "الوصل" سے کام لیا۔

31۔ القرآن، سورۃ القمان ۳۱:۶

32۔ القرآن، سورۃ الشعراء ۲۶:۱۵۴

[33]۔ یہاں تسخیر (معدہ اور پھیپڑے والا ہونا) کی تاکید بشریت ہے۔ یہاں صالح علیہ السلام کا قصہ ہے۔

34۔ القرآن، سورۃ الشعراء ۲۶:۱۸۶

[35]۔ واو داخل کیا کہ جادو سے متاثر ہونا اور بشریت دونوں رسالت کے خلاف نہیں ہیں یہ قصہ شعیب علیہ السلام کے بارے میں ہیں۔

[36]۔ جمال ابو حسان نے کہا ہے کہ مسخرین کا ایک معنی معدہ اور پھیپڑے والا ہونا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھاتا پیتا ہے۔ لہذا صالح علیہ السلام کے قصے میں یہی معنی لیا گیا جو کفار کے خیال میں رسالت کے منافی ہے۔ اس معنی کی تاکید کے لیے کفار نے کہا ما انت الا بشر۔ لہذا دونوں جملوں میں کمال اتصال ہے اس طرح واو کو لانا ٹھیک نہیں کیونکہ دونوں ہم معنی ہیں۔ جبکہ وما انت سے پہلے مسخرین کا معنی مسحور ہے یعنی جس پر جادو کیا گیا ہو۔ لہذا وما انت الا بشر سے عدم رسالت کی دوسری الگ سے دلیل ذکر کی لہذا کمال اتصال نہ ہوا۔ تو حرف عطف کا استعمال کیا گیا ہے۔ www.addustour.com>article-October ۷۸۹۵-۱۷ ۲۰۰۶

37۔ القرآن، سورۃ ھود ۱۱:۶۹

38۔ ایضاً

[39]۔ جملہ اسمیہ ثبات پر دال ہے اور فعلیہ تجدد اور حدوث پر۔ التفسیر السعدی (عبد الرحمن السعدی م ۱۹۵۶ عنیزہ قسیم سعودی عرب) میں اسی آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ فرشتوں نے جملہ فعلیہ سے سلام کہا جو حدوث پر دلالت کرتا ہے اور ابراہیم نے سلام جملہ اسمیہ کا استعمال کیا جو ثبوت پر دال ہے۔ اور پہلے سے بہتر ہے اصول یہ ہے کہ سلام کا جواب بہتر طریقے سے دینا چاہیے۔

[40]۔ فعل میں تجدد اور حدوث ہوتا ہے یعنی جتنی بار شیطان مس کرے گا اتنی بار ہوشیار ہونگے۔

41۔ القرآن، سورۃ الاعراف ۷:۲۰۱

42۔ ترجمہ: ازآسان ترجمہ قرآن

[43]۔ یہاں جملہ اسمیہ ہے جو ثبوت اور دوام پر "دال" ہے یعنی ان کی بصیرت قائم و دائم رہتی ہے۔

44۔ القرآن، سورۃ الاعراف ۷:۲۰۱

[45]۔ السیوطی نے الاتقان میں فواصل آیات کی بحث میں آیات کے آخری کلمہ میں مناسبت پیدا کرنے کے وہ چالیس احکامات ذکر کیے

ہیں جن کی وجہ سے اصولوں کے مخالف امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ نمبر ۱۴ میں مثال پیش کی ہے وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَبِٱلْيَوْمِ ٱلْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ (البقرہ ۲:۸) کیونکہ اگلی آیت میں ومایشعرون ہے لہذا ایک وجہ یہ بھی کہ ولم یؤمنو یا و آمنو ننہیں فرمایا تاکہ فاصلہ (جس طرح شعر کی صورت میں قافیہ کہتے ہیں اور نثر کی صورت میں سجع کہتے ہیں) درست رہے۔ (السیوطی، الاتقان، نوع ۵۹، فصل، آیتوں کے آخر کے مناسبت کے احکام، ص ۲۹۸، ج ۳)

46۔ ان شرطیہ کے برعکس "اذا" یقینی، غالب اور کثیر الوقوع باتوں پر داخل ہوتا ہے اور "ان" مشکوک، موہوم اور نادرالوقوع باتوں پر داخل ہوتا ہے۔ اچھائیوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے "اذا" کا استعمال کیا کیونکہ خدا کی نعمتیں بکثرت اور یقینی ہیں۔ اور بدی کی جانب میں "ان" کو وارد کیا۔ کیونکہ بدی کم واقعہ ہونے والی اور مشکوک چیز ہے۔ (السیوطی، الاتقان، نوع ۴۰، "اذا" اور "ان" کا فرق، ص ۱۵۰، ۱۵۱، ج ۲)

47۔ القرآن، سورۃ الاعراف ۷:۱۳۱

[48]۔ نعمت اور رحمت کا وقوع یقینی ہے تو ماضی کا صیغہ لایا گیا کیونکہ ماضی کا وقوع یقینی ہے۔ اسی طرح "اذا" کی مدخول کا وقوع بھی یقینی ہے۔

[49]۔ اور ان کے مدخول کا وقوع یقینی نہیں ہوتا اس لیے برائی جس کا وقوع یقینی ہے وہاں "ان" اور استقبال کا استعمال کیا گیا۔

50۔ القرآن، سورۃ الروم ۳۰:۳۶

51۔ الموافقات، ص ۲۱۴ تا ۲۱۷، ج ۴

52۔ القرآن، سورۃ البقرۃ ۲:۲۴۵

53۔ القرآن، سورۃ الانعام ۶:۱۸۱

54۔ الموافقات، ص ۲۱۸، ج ۴

55۔ القرآن، سورۃ آل اعمران ۳:۱۳۸

56۔ الموافقات، ص ۲۲۴ تا ۲۲۶، ج ۴

57۔ الموافقات، ص ۲۳۱، ۲۳۲، ج ۴

[58]۔ القرآن، سورۃ النمل ۲۷:۱۶

[59]۔ الموافقات، ص ۲۳۱، ۲۳۲، ج ۴

[60]۔ السیوطی، الاتقان نوع ۷۸ مفسر کی شرطوں اور اس کی آداب کی شناخت۔ فصل۔ قرآن کے بارے میں صوفیا کا کلام، ظاہر و باطن، حد و مطلع، ج ۴، ص ۱۹۶ تا ۱۹۸

61۔ السیوطی، الاتقان، ص ۲۴-۳۲، ج ۳

[62]۔ الموافقات، ج ۴، ص ۲۳۵ تا ۲۳۷

63۔ القرآن، سورۃ البقرۃ ۲:۲۲

64۔ القرآن، سورۃ التوبۃ:۳۱۹

65۔ القرآن، سورۃ الاحقاف ۴۶:۲۰

66۔ القرآن، سورۃ الاحقاف ۴۶:۲۰

67۔ الموافقات، ص ۲۴۲ تا ۲۴۵، ج ۴

68۔ القرآن، سورۃ آل عمران ۳:۹۶

69۔ القرآن، سورۃ النساء ۴:۵۱

70۔ القرآن، سورۃ النساء ۴:۳۶

71۔ ایضاً

72۔ ایضاً

73۔ ایضاً

74۔ الموافقات، ص ۲۴۷ تا ۲۴۹، ج ۴

75۔ الموافقات ج ۴، ص ۲۵۳-۲۵۴، الموافقات، اردو ترجمہ، ج ۳، ص ۵۸۴ تا ۵۸۷

76۔ الموافقات ج ۴، ص ۲۵۶ تا ۲۵۸، الموافقات، اردو ترجمہ، ج ۳، ص ۵۸۷ تا ۵۸۸

77۔ مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعاً، حدیث نمبر ۱۴۸

78۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قولہ (یا اہل الکتاب لا تغلوا فی دینکم۔۔۔)، حدیث نمبر ۳۴۳۵

79۔ القرآن، سورۃ المائدۃ ۵:۹۳

80۔ القرآن، سورۃ البقرۃ ۲:۱۴۳

81۔ الموافقات، ص ۲۵۸ تا ۲۶۰ ج ۴

82۔ الموافقات ج ۴، ص ۲۸۴، ۲۸۳، الموافقات، اردو ترجمہ، ج ۳، ص ۶۱۴